پیش لفظ

استاذِ عصر

کیا لکھوں اور کیسے لکھوں ۔۔۔۔ اُس شخص کے بارے میں کہ جو عبارت کے احاطے میں ہی نہیں آتا ۔۔۔ کہ جس کے بارے میں لکھنا یا بولنا شروع کریں تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں ۔خیالات کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو سمیٹنا ناممکن ہو جاتا ہے،اس کی شخصیت کے کس پہلو سے بات شروع کروں اور کس پر ختم ۔اور پھر بھی نہ جانے کتنے پہلو ایسے رہ جائیں جن کا احاطہ نہ ہو سکے ۔اور پھر یہ کہ کوئی تو پہلو اس کی شخصیت کا ایسا بھی ہو کہ جو دیگر پہلوؤں کی نسبت کم مضبوط اور کم روشن ہو ۔مگر ایسا ہے نہیں ۔اس شخص کے بارے میں لکھتے ہوئے ہچکچاہٹ صرف مجھے ہی درپیش نہیں بلکہ ہر وہ شخص اس امتحان سے گزرا ہے جس نے یہ جسارت کی ہے ۔ممتاز مفتی جیسا ثقہ قلمکار بھی یہ حق ادا نہ کر سکا ۔اور حق ادا بھی کیسے ہو کہ وہ شخص اگر معجزہ نہیں تو معجزہ سے کم بھی نہیں ۔کہ جس کی زندگی کا ایک ایک سانس خالقِ کائنات کے ساتھ کسی نہ کسی طرح جڑا ہوا ہے ۔کہ جس نے ترجیحات کے فلسفے کو ازسرِنو زندہ کرتے ہوئے خدا کو انسان کی ترجیحِ اول قرار دیا ۔کہ جس نے اپنی زندگی کو خدا کے لیے وقف کیا تو اس کا حق ادا کر دیا ۔اور جس نے اس مالکُ الملک کی تسبیح کی ٹھانی تو نہ صرف خود بلکہ لاکھوں دیگر افراد کو اس سعادت کا حقدار ٹھہرا دیا ۔اور جس نے اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ متشابہات جیسے موضوع پر جراتِ خیال کا مظاہرہ کیا اور جو اسلامی تاریخ کی وہ پہلی شخصیت ہے کہ جس نے حروفِ مقطعات کی بنیاد پر علمُ الاسماء کی ایک باقاعدہ شاخ متعارف کرائی اور اسماء کو ان کی صفات بخشتے ہوئے اس علم کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور جس پر اللہ رب العزت کا اتنا کرم ہے کہ اسے اپنا نام بتا کر مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ خود یہ کام کر دیتا ہے ۔

پروفیسر احمد رفیق اختر سے پہلے بہت بڑے علماء اور فضلاء گزرے ہیں لیکن پروفیسر صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جو علم اللہ نے انھیں عطا کیا ہے وہ شاید پہلے کسی بھی شخص کو حاصل نہیں ہوا علمُ الاسماء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ محی الدین ابن عربیؒ کو اس کی تسن شُد تھی اور وہ اس کی مختلف

جہات سے واقف تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اس علم کا عملی شکل میں کبھی جامع مظاہرہ نہیں کیا، جبکہ پروفیسر صاحب روزانہ سینکڑوں لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران اس علم کے زریعے انھیں نہ صرف اسمائے حسنٰی دیتے ہیں بلکہ ان کی شخصیات کے مختلف باطنی پہلوؤں کے بارے میں انہیں آگاہ بھی کرتے ہیں۔ ان کی بیماریوں کا علاج بھی انہی اسما اور مسنون دعاؤں کے ذریعے تجویز کرتے ہیں۔ نوجوانوں کی شادیوں کے سلسلے میں وہ اسی علم کی بنیاد پر یہ بتادیتے ہیں کہ کونسا نام آپ کے لئے موزوں ہوگا اور یہی اصول نوزائیدہ بچوں کے نام رکھنے پر بھی منطبق کرتے ہوئے لوگوں کے لیے آسانی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کا نام ہی اس کی زندگی کا پروٹوکول ہے۔ اس کے نام میں اس کی زندگی کے نشیب و فراز، مزاج، بیماریاں، رزق اور دیگر تمام پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں اور یہ کہ کچھ ناموں کی کچھ کے ساتھ موانست اور کچھ سے مخاصمت۔ باہمی موانست والے یکجا ہونگے تو امن اور سکون رہے گا اور مخاصمت والے اکٹھا ہونگے تو لڑائی اور فساد۔ یہ وہ Basic Categories کا علم ہے جو اللہ تعالٰی نے پروفیسر صاحب کو عطا کیا ہے۔ یہ اتنا مسحور کن علم ہے کہ دیکھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ ہم جس شخص کو سالوں ساتھ رہنے کے باوجود بھی نہیں جان سکتے پروفیسر صاحب اس کا نام سن کر ہی جان جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو اسمائے ربانی دینے کے لیے ضروری تھا کہ میں ان کے باطن کو جان سکوں۔ اللہ نے مجھے یہ علم اس لیے دیا کہ میں لوگوں کی اپنے بارے میں کہی ہوئی باتوں سے دھوکہ نہ کھاؤں اور ان کا صحیح تجزیہ کرسکوں۔

قرآن کے ان الفاظ کے مطابق کہ اللہ کے بندے کائنات کے اسرار و رموز پر بھی غور و فکر کرتے رہتے ہیں پروفیسر احمد رفیق اختر کائناتی علوم پر خاص دسترس رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ہونے والے سائنسی تحقیقی کام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ Cosmology ان کا پسندیدہ مضمون ہے۔ Big Bang کے بارے میں اکثر بیان کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ جانے سے پہلے میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ Cosmology پر تازہ ترین کوئی کتاب ملے تو لیتے آنا۔ وہ سائنسی تحقیقات سے قرآن کے حقائق کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں قرآن کتاب تخلیق ہے اور

سائنس کتاب تحقیق ۔خلائی تحقیق پر بھی خاص نظر رکھتے ہیں۔ایک دفعہ میں اور ایک اور شخص پروفیسر صاحب کو ملنے کے لئے گوجر خان گئے ۔یہ صاحب Space Technology کے شعبے سے منسلک تھے اور پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔پروفیسر صاحب حیران کن طور پر ان کے ساتھ دو گھنٹے تک صرف اسی شعبے کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔

پروفیسر صاحب علم کی تمام شاخوں پر دسترس رکھتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی محفل میں سوال کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔کوئی شخص کوئی بھی سوال اٹھا سکتا ہے اور پروفیسر صاحب انتہائی خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ علم سوال سے ہے ۔حضرت عباسؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنا علم کیسے دیا۔فرمایا میں سوال بہت کرتا تھا۔پروفیسر صاحب سوال کرنے والے کو بہت پسند کرتے ہیں۔سوال کتنا بھی اُوٹ پٹانگ یا پست علمی کی بنیاد پر کیا گیا محسوس ہو وہ اس کا جواب اتنے ہی علمی انداز اور جامعیت کے ساتھ دیتے ہیں ۔ایک عام عالم دین یا دانشور اور پروفیسر صاحب کی محفل کا یہ بنیادی فرق ہے کہ یہاں سوال کرنے والا سوال کرنے والا سوال کرتے ہوے گھبراتا نہیں اور جواب دینے والا اس خوف میں مبتلا نہیں ہوتا کہ کوئی سوال ایسا نہ آجائے جس کا جواب اس کے پاس نہ ہو۔آج تک کبھی ایسا نہ ہوا۔یہ اللہ کا انعام نہیں تو اور کیا ہے!!!

پروفیسر صاحب کا کمال یہ ہے کہ قرآنی اصول "لم تقولون مالا تفعلون" کے تحت وہ جو بھی کہتے ہیں پہلے اس کو خود اپنے اوپر لاگو کرتے ہیں۔حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس سال مجاہدہ کیا۔میں نے علم اور اسکے مطابق عمل کرنے سے کسی اور چیز کو اپنے لیے مشکل نہ پایا۔پروفیسر صاحب اس مشکل ترین کام کو بھی بآسانی انجام دیتے ہیں۔اگر لوگوں کو تسبیح کرنے کیلئے کہتے ہیں تو خود ان سے کہیں زیادہ ذکر الٰہی کرتے ہیں۔اگر لوگوں کو توازن کی تلقین کرتے ہیں تو خود ان کی زندگی اس کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔لوگوں کو اگر نارمل اور سادہ زندگی کا سبق پڑھاتے ہیں تو خود سادگی اور Normalcy کی بہترین مثال ہیں۔جہاں مخلوق خدا کے ساتھ وقت گزارتے ہیں وہاں اپنے اہل خانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے بھی جاتے ہیں۔وہ

عام لوگوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں حالانکہ وہ عام نہیں اور یہی ان کے لیے مشکل کام ہے کہ غیر معمولی ہوتے ہوئے بھی عام لوگوں کی طرح زندگی گزاریں۔ لیکن یقین جانئے کہ وہ یہ مشکل کام بھی کامیابی سے کر رہے ہیں اور اس سب کچھ کی وجہ صرف اور صرف علم ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ علم کی دو بنیادی خصوصیات ہیں۔ اپنی ترجیحات اور حدود کو متعین کرنا۔

ضبط و تحمل اگر کسی نے فی زمانہ سیکھنا یا دیکھنا ہو تو کسی اتوار کو گوجرخان کا قصد کرے۔ تین چار سو لوگ اپنے گوناگوں مسائل لیکر اس راہِ سلوک کے مسافر سے ملتے ہیں اور اس کے ماتھے پہ ایک شکن نہیں پڑتی۔ خواتین اپنے گھریلو مسائل سے لیکر اپنے بچوں کی شادیوں کے مشوروں تک ان سے پوچھتی ہیں اور ایک ایک سوال بار بار دھراتی ہیں مگر اس شخص کا تحمل ہے کہ خدا یاد آجاتا ہے۔ وہ ایک ایسا سمندر ہے جہاں ہر شخص آتا ہے اور اپنے غم اور پریشانیاں اس میں ڈال کر چلا جاتا ہے۔ وہ کسی کو اس کے گنہگار ہونے کا احساس نہیں دلاتا بلکہ اسے اللہ کی رحمت کی امید دلاتا ہے۔ ڈھارس بندھاتا ہے۔ دلاسہ دیتا ہے۔

فہم قرآن کی بات کی جائے تو انسان حیران ہو جاتا ہے کہ جو فہم و ادراک انہیں نصیب ہوا ہے وہ گذشتہ کئی صدیوں میں شاید ہی کسی کو حاصل ہوا ہو۔ بڑے سے بڑے مسائل کی گتھیاں وہ آنِ واحد میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں سلجھا دیتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت ان کا معمول ہے۔ اگرچہ وہ صرف و نحو کے تکنیکی مراحل سے نہیں گزرے لیکن جن لوگوں نے انہیں تلاوتِ کلامِ پاک کرتے سُنا ہے وہ ان کی خوش الحانی پر ضرور گواہی دینگے۔

پروفیسر احمد رفیق اختر کا میری نظر میں ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو انتہائی آسان بنا کر پیش کیا ہے۔ ریاضی یا فزکس کے کسی فارمولے کی طرح وہ ایک Thesis استوار کرتے ہیں اور دو تین Steps کے بعد ایک سائنسی نتیجے پر پہنچ کر مسئلے کا حل پیش کر دیتے ہیں جو انتہائی آسان اور قابلِ عمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ملنے والے جب آتے ہیں تو ان کے ذہنوں پر مسائل کا ایک بارِ گراں ہوتا ہے مگر جب واپس جاتے ہیں تو برگِ گل کی مانند ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ خوف پریشانی اور نا امیدی کے اس دورِ ابتلاء میں کوئی

تو ہے کہ جو ہزاروں لوگوں کے لیے راحت، امید بلکہ زندگی کی شمعیں روشن رکھنے کا باعث ہے۔
قرآن کی اس آیت "یوثرون علی انفسھم ولوکان بہم خصاصۃ (وہ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود انہیں اس کی حاجت ہو) کے مصداق پروفیسر صاحب لوگوں کے لیے اپنا آرام، وقت اور پیسہ تک قربان کر دیتے ہیں۔ اکثر دیکھا ہے کہ لوگ ایسے اوقات پر بھی ان کے پاس آجاتے ہیں کہ جو ان کے آرام یا فیملی کا وقت ہوتا ہے۔ مگر وہ کمال مہربانی کرتے ہوئے ان سے نہ صرف ملتے ہیں بلکہ انہیں اپنی بے آرامی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتے۔ بیسیوں گھرانے ایسے ہیں جن کی وہ چپکے سے مالی امداد کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ ان کی عزت نفس کا ہر حال میں خیال رکھتے ہیں۔

شناختِ خداوندان کا بنیادی موضوع ہے اور اسلام کو وہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے واحد راستہ گردانتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مذاہب نظریات اور ان کے ارتقاء پر ان کی نظر نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف نظریات اور مذاہب کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد ہی وہ اسلام کی حقانیت کے نتیجے تک پہنچے ہیں۔ وہ مغرب کے مذہبی اور غیر مذہبی نظریات کو اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ خدا اور مذہب کے خلاف مغرب کا پروپیگنڈا ان کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ مثلاً گزشتہ برس انہوں نے لاہور کے لیکچر میں تفصیل سے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جن میں آئین سٹائین کہتا ہے کہ I do not believe in personal God. اور یہ بھی کہ I am a deeply religious non-believer مغربی دانشور مذہب کو عزت دیئے جانے کے بھی خلاف ہے اور کہتا ہے کہ Previliging of religion ہی سب مسائل کی جڑ ہے۔ عصر حاضر کا سب سے بڑا ملحد رچرڈ ڈاکنز (Richard Dawkins) تو مذہب کو ضیاع اور ایک فضول چیز کے ساتھ extravagence کہتا ہے اور یہ بھی کہ فطرت کسی فضول چیز کو اپنے ہاں برداشت نہیں کر سکتی۔ نوبل انعام یافتہ فزکس کا استاد Steven Weinberg مذہب کے بارے میں یوں رقمطراز ہے...... Religion is an insult to human dignity. آج کے دور میں مغربی پروپیگنڈا کا منہ توڑ جواب علمی سطح پر کوئی

دے رہا ہے تو وہ پروفیسر احمد رفیق اختر ہیں۔

پروفیسر صاحب کے ہاں اعلیٰ قسم کی حس مزاح بھی پائی جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ راہ سلوک کے مسافر کیلئے حس مزاح کا ہونا لازم ہے کہ اس کی بدولت وہ لوگوں میں مسکراہٹیں بکھیرتا ہے ان کے غم بانٹتا ہے اور پریشانیوں کو کم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ان کے ہاں مزاح انتہائی اعلیٰ اور ارفع معیار کا ہوتا ہے کہ جس سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب انتہائی نرم خو ہیں۔ غصہ تو کبھی شاید انہیں چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یاد نہیں پڑتا ہے کہ آخری دفعہ انہیں غصہ کب آیا تھا۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ آپ کو غصہ کیوں نہیں آتا۔ کہنے لگے بہت آتا تھا بلکہ ہمارے جینز (Genes) میں انتہا کا غصہ ہے مگر تسبیح کے اثرات سے زائل ہو گیا ہے اور پھر انہوں نے حدیث رسولؐ سنائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اللہ نرمی کرنے والا ہے۔ نرمی کو پسند کرتا ہے نرمی پر دیتا ہے سختی پر نہیں دیتا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے ایک بار یہ بھی پوچھا کہ آپ لوگوں میں اتنی محبت کیسے بانٹتے ہیں کہ ہر شخص آپکے خلوص کا اسیر نظر آتا ہے۔ کہنے لگے کہ اس حدیث رسولؐ نے ہمیشہ رہنمائی کی کہ لوگوں سے محبت کرنا نصف عقل ہے اور پھر ہمیشہ رسول اللہؐ کا نمونہ سامنے رہا کہ جو مرقع خلوص و محبت تھے۔ وہ نبی کریمؐ کی ذات کو نمونہ کامل گردانتے ہیں اور ان سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا شرک ہے اسی طرح رسول اللہؐ کے ساتھ محبت میں بھی کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ کائنات کے سب سے بڑے دانشور رہیں اور جب تک معیارِ عقل و نظر لگتے رہیں گے محمد رسول اللہ ﷺ کی خاک پا کو بھی کوئی ذہانت نہیں پہنچ پائے گی۔

پروفیسر صاحب خدا کو بے دلیل ماننے یعنی Blind Faith کے سخت خلاف ہیں اور قرآن ہی کے ذریعے اس کا جواب دیتے ہیں کہ بدترین جانور میرے نزدیک وہ ہیں جو علم و عقل سے کام نہیں لیتے۔ اندھوں اور بہروں کی طرح میری آیات پر گرتے ہیں اور پھر قرآن کی ہی ایک اور آیت کا حوالہ دیتے ہیں کہ جو ہلاک ہوا وہ دلیل سے ہلاک ہوا اور جو زندہ ہوا وہ دلیل سے زندہ ہوا۔ وہ عقل سے کام لینے پر اکساتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عقل ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے شناخت

خداوندکا۔ یہاں بھی وہ حضرت ابوھریرہؓ کی روایت کردہ طویل حدیث سے استنباط کرتے ہیں جس میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ میں نے عقل سے زیادہ بہتر، خوبصورت اور افضل کوئی مخلوق نہیں بنائی۔ میں تیرے سبب لوں گا اور تیرے ہی سبب دونگا اور یہ کہ میں تیرے ہی سبب پہچانا جاؤنگا۔

پروفیسر صاحب دنیا میں رہ کر اس کے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے راہ حق پر چلنے کے حق میں ہیں اور ترک دنیا کے سخت خلاف۔ وہ کہتے ہیں جہاں ٹسٹ نہیں وہاں رزلٹ نہیں۔ وہ خود اس ٹسٹ سے روزانہ گزرتے ہیں اور سرخرو ہوتے ہیں۔ سینکڑوں پریشان حال لوگوں سے ملتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ضرور ہے مگر تنگ نہیں کرتا۔ نوجوانوں کے لیے بالخصوص اور عام مسلمانوں کے لیے بالعموم ان کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ جو مرضی کرو، تفریحات میں وقت گزارلو، ٹی وی دیکھ لو، کرکٹ کھیل لو مگر تمہارے سامنے تمہاری ترجیحات واضح ہونی چاہیں اور پھر دیگر ترجیحات کے ساتھ پوری زندگی کی بھی ایک ترجیح ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل بات بے رنگ ہونا ہے جس صورتحال سے بھی گزرنا پڑ جائے تو گزرو مگر اس کا رنگ قبول نہ کرو۔ رنگ اگر قبول کرو تو صرف صبغتہ اللہ۔

پروفیسر صاحب پر ابوالحسن نوریؒ کی تصوف کی تعریف صادق آتی ہے کہ تصوف آزادی وجوانمردی، ترکِ تکلف وسخاوت اور دنیا کا مال راہِ حق میں خرچ کرنا ہے۔ آزاد ہونا دراصل یہ ہے کہ انسان خواہشِ نفس سے آزاد ہو جائے اور پروفیسر صاحب کے ہاں ہمیں یہ چیز واضح نظر آتی ہے کہ وہ دنیا کے مرغوبات سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔ اسباب کا ہونا یا نہ ہونا ان کے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ یوں حضرت بایزید بسطامیؒ کے قول کے مطابق پروفیسر صاحب ولی اللہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ ولی کسے کہتے ہیں تو جواب دیا کہ ولی وہ ہے کہ اللہ تعالٰی کے اوامر و نواہی پر صابر ہو۔ پروفیسر صاحب کے ہاں کوئی خوف ہے اور نہ حزن (No Fears or Frustrations) یہ بات ان کو جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے کبھی ان کے ہاں کسی قسم کا ڈپریشن دیکھا اور نہ محسوس کیا۔

صحو (Sobriety) اور سکر (Ecstacy) کی بحث میں وہ صحو کو افضل سمجھتے ہیں اور

حضرت جنید بغدادیؒ کے قول پر یقین رکھتے ہیں کہ صحو کا ایک قطرہ سُکر کے سمندر سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ نفس کے اشکالات اور ان سے نبرد آزما ہونے کے بارے میں پروفیسر صاحب کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہوائے نفس پر قابو پانا شناختِ خدا کے سفر میں انتہائی ضروری ہے کیونکہ حدیثِ رسولؐ کے مطابق سب سے زیادہ خوفناک چیز جس سے میں اپنی امت کے متعلق ڈرتا ہوں وہ خواہشِ نفس کی پیروی اور لمبی آرزو ہے۔ سیدِ ہجویریؒ کے مطابق خواہش کا چھوڑ دینا بندے کو امیر کر دیتا ہے اور اس کی پیروی کرنا امیر کو اسیر بنا دیتا ہے۔ سیدِ ہجویر علی بن عثمان المعروف داتا گنج بخشؒ کا ذکر آیا ہے تو یہ بتانا مناسب ہوگا کہ پروفیسر صاحب انہیں اپنا استاد تصور کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اولیاءاللہ صوفیاء اور اہل اللہ میں سیدِ ہجویرؒ سے بڑا استاد اور دانشور انہوں نے نہیں دیکھا۔ "کشف المحجوب" کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب میں نے پڑھی نہیں بلکہ مجھ پر بیت گئی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے اسی رشتہ کے سبب اپنے آپ کو بھی صوفی بزرگ، ولی اللہ یا سابقوں اور لاحقوں سے مزین نائیٹل سے بلوائے جانے کے بجائے ایک استاد کہلوانا پسند کرتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ مہمان نواز اور بہترین میزبان نہیں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کو دو چیزیں بہت ہی پسند ہیں۔ حسنِ کلام اور حسنِ طعام، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کے لیے بہترین کھانوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ نت نئی ڈشیں بنوا کر اپنے گھر آنے والوں کو پیش کرتے ہیں سوتے بھی بہت کم ہیں۔ پوچھنے پر ایک بار بتانے لگے کہ تین یا ساڑھے تین گھنٹے سو لیتا ہوں۔ تسبیح اتنی زیادہ ہے پھر مخلوقِ خدا کو بھی خاصا وقت دینا ہوتا ہے۔ رات کو اٹھ کر تسبیح پوری کرتے ہیں۔ ایسے میں نیند کہاں اور آرام کہاں!

پروفیسر صاحب خدا کے بہت قریبی اور بے تکلف دوست محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ اس سے اپنے سوالات زیرِ بحث لاتے ہیں۔ گلے شکوے ہوں تو وہ بھی اُسی سے کرتے ہیں۔ کسی بھی سلسلے میں مدد درکار ہو تو فوراً اسی سے رابطہ استوار کرتے ہیں۔ لگتا یوں ہے کہ وہ عرفانِ ذاتِ حق کے تمام مراحل عبور کرتے ہوئے شناختِ خداوندی کی منزل پا چکے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو وہ مرتبہ عطا کر دیا ہے جو عصر حاضر میں کسی کو حاصل نہیں کیونکہ خود ان کے بقول تمام مراتب شناخت کی بنیاد پر ہیں اور یہ بھی کہ خدا سے باتیں کئے بغیر انسان پورا انسان ہی نہیں بنتا۔ ان کے نزدیک تصوف صرف اور صرف جستجوئے خداوند ہے۔ بہترین عقل و شعور کے ساتھ بہترین عمر میں ترجیح اول (یعنی اللہ تعالٰی) کا انتخاب تصوف ہے۔ پروفیسر صاحب کو غالب کا یہ شعر بہت پسند ہے کہ وہ ان کے فلسفہ ترجیحات کی بہترین عکاسی کرتا ہے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

پروفیسر صاحب کا شعر و شاعری سے بھی خاصا شغف رہا ہے بلکہ وہ خود بھی شاعری کرتے رہے ہیں۔ جان ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" کا ترجمہ بھی وہ کر چکے ہیں کہ جس کے بارے میں ناقدین کا خیال تھا کہ اس کتاب کا اس قدر خوبصورت ترجمہ ہو نہیں سکتا تھا انہیں ہزاروں اشعار آج بھی یاد میں اگرچہ وہ حصولِ ترجیح اول کے سفر میں شعر کہنے کو ایک عرصہ پہلے خیرباد کہہ چکے ہیں اور ان کے اشعار سارے کے سارے چرائے جا چکے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو قدرت نے بلا کا حافظہ عطا کیا ہے۔ Photogenic memory کا لفظ ان پر صادق آتا ہے۔ ایک بار جو چیز انہوں نے پڑھی پھر وہ بھولی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نویں دسویں جماعت تک وہ مشرق و مغرب کے تمام علوم، کتب احادیث، فلاسفہ یونان وغیرہ بقول خود ان کے "چاٹ" چکے تھے اور ان کا تجزیہ کر کے اپنے نتائج اخذ کر چکے تھے۔

میری نظر میں پروفیسر احمد رفیق اختر بلا مبالغہ اس دور ہی کی نہیں بلکہ گذشتہ ہزار سالوں کی سب سے بڑی علمی شخصیت ہیں کہ جو نہ صرف گذشتہ علمی روایت پر دسترس رکھتی ہے بلکہ مستقبل کا بھی پتہ دیتی ہے۔ جو علم اور فہم اللہ کی ذات نے انہیں بخشا ہے وہ شاید ہی کسی کو بخشا ہو۔ اس لحاظ سے وہ استاذ الف ثانی بھی ہیں۔ دوسری طرف چونکہ دنیا کی زندگی میں بھی اب ہم "وقتِ عصر" سے ہی گزر رہے ہیں اور اختتام کی جانب رواں دواں ہیں اس لیے میں انہیں استاذِ عصر بھی کہتا ہوں۔ اور پھر عصر کے معنی زمانہ کے بھی ہیں اس لیے وہ اس زمانے کے بھی سب سے بڑے استاد

ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "استفسارات" کے لیے پیش لفظ لکھنا میرے لیے زندگی کے سب سے بڑے اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ممکن بھی اس لیے ہوا کہ پروفیسر صاحب کا حکم تھا ورنہ اپنے استاد کے بارے میں چند الفاظ لکھنے کا بھی حوصلہ کم از کم مجھ میں نہیں تھا۔ ایک ذرّہ زمیں آفتابِ زمانہ کا کیا تعارف کرائے گا۔ اس کتاب میں بنیادی طور پر سوال وجواب پر مشتمل نشستوں کو شامل کیا گیا ہے اور مقصد یہی تھا کہ لوگوں کے پاس یہ کتاب ایک ریفرنس بک کے طور پر موجود ہو اور وہ جب چاہیں اس سے روزمرہ کے مسائل پر استفادہ کر سکیں۔ اس کتاب کا بہت بڑا کریڈٹ محترم شبیر احمد چوہدری، انجم محمود گیلانی اور ان کی ٹیم کو جاتا ہے کہ جنہوں نے اپنی شبانہ روز محنت کے سبب اس کتاب کو حقیقت کا روپ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ "استفسارات" کہ جس کا نام بھی پروفیسر صاحب نے خود تجویز کیا ہے متلاشیانِ علم وحکمت کے لیے آگہی اور عرفان کا بہت بڑا ذریعہ بنے گی اور یوں علم کی شمعیں فروزاں کرنے کا سفر جاری رہیگا۔

آخر میں دعا ہے کہ ربِ کائنات ہمیں اپنی ترجیحات کو درست کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی زندگیوں کو قرآن وسنت کی روشنی میں از سرِ نو ترتیب دینے کے قابل بنائے اور یہ دعا بھی کہ اے خدایا میری عزت کے لیے کافی ہے کہ میں تیرا ہی بندہ ہوں اور میرے فخر کے لیے کافی ہے کہ تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو بالکل اسی طرح ہے جس طرح میں چاہتا ہوں مجھے بھی اسی طرح بنادے جس طرح تو چاہتا ہے۔ آمین ثم آمین

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم وبیش را

اسرار احمد کسانہ۔ اسلام آباد
یکم فروری 2011